اقبالؒ کا تصوّرِ خودی

حکیم احمد شجاع پاشا

گاہے گاہے باز خواں

حکیم احمد شجاع پاشا مرحوم ان نامور ماہر اقبالیات میں سے تھے جنہیں ان کی فکری اور علمی صحبتوں سے فیض یاب ہونے کا موقع نصیب ہوا ان کا یہ مقالہ علامہ کے تصوف خودی کی ایک دلآویز تفسیر ہے۔ "گاہے گاہے باز خواں" کے حوالے سے ہم اقبالیات میں مشاہیر کے وہ مقالات بھی شائع کرتے رہیں گے جن سے علامہ کے فکر و فن کی تفہیم میں نئی نسل کی رہنمائی ہو سکے حکیم مرحوم کا یہ مقالہ اسی سلسلے کی ایک سعی ہے۔

(ادارہ)

ہر ندرت پسند اور جدت آفرین شاعر اپنے نتائجِ فکر کے اظہار کے لیے کوئی نہ کوئی اسلوبِ بیان تلاش کر لیتا ہے اور مروجہ الفاظ ہی کو نئے معنوں سے آراستہ کرکے اپنے بیان کی زینت بناتا ہے۔ ظاہر ہے کہ مروجہ الفاظ کے نئے معانی عام لوگوں کی سمجھ میں ذرا مشکل سے آتے ہیں، کیونکہ کسی شاعر کے کلام کو پڑھنے یا سننے والے کم و بیش وہی لوگ ہوتے ہیں جو ان الفاظ کے پرانے معنوں سے آشنا ہوں۔ حافظ شیرازی نے جب اپنے افکار کو الفاظ کا جامہ پہنایا تو اس نے عشق، ہجر، وصل، مے، پیرِ مغان، سجادہ، ساغر، چنگ اور رباب کے الفاظ کو خاص معنوں میں استعمال کیا۔ لیکن حافظ کے کلام کو پڑھنے اور سننے والے اپنے ذہن کو ان الفاظ کے پرانے معنوں سے آزاد نہ کر سکے اور حافظ کے اندازِ بیان کے آئینے میں ان تجلیات کو نہ دیکھ سکے جن کی روشن شعاعوں سے وہ آلامِ حیات کی تاریکیوں کو دور کرنا چاہتا تھا اور جن کی زرافشانیوں سے وہ انسان کے دوام کا نقش جریدۂ عالم پر ثبت کر رہا تھا۔

بدقسمتی سے غلط فہمی کی یہی دیوار اقبال کے کلام اور اس کے پڑھنے اور سننے والوں کے درمیان حائل ہو گئی ہے۔ جب اقبال نے اسرارِ خودی کی نظم کے مختلف حصے لکھے، مجھے اقبال کی صحبت کی سعادت میسر رہی اور میں اس ہنگامے سے باخبر ہوں جو اس وقت اس نظم کے پیرایۂ بیان نے بالعموم اور خودی کے لفظ کے استعمال نے بالخصوص سوچنے اور سمجھنے والے لوگوں کے دل و دماغ میں پیدا کر دیا تھا۔

جب اقبال نے انسان کے تشخصِ تعین یا عرفانِ نفس کے لیے خودی کا لفظ ڈھونڈ نکالا اور اپنے افکار کی بلند عمارت اس نئے مفہوم پر استوار کی جس سے اس نے خودی کے لفظ کو آراستہ کیا تھا تو ایسے لوگوں کی کوئی کمی نہ تھی جن کو خودی کے اس نئے معنی سے اتفاق نہ تھا۔ مجھے یاد ہے کہ قریب قریب ہر روز ایسے لوگ اقبال کے ارد گرد جمع ہو جاتے تھے۔ جو اس نظریئے کو تو پسند کرتے تھے، جس کے اظہار کے لیے اس نے خودی کا لفظ تلاش کر لیا تھا، مگر جو خودی کے لفظ کو اس نظریئے کے اظہار کے لیے پسند نہیں کرتے تھے بعض لوگوں نے خودی کی جگہ خود اعتمادی خودداری، خودشناسی جیسے لفظ بھی تجویز کیے۔ مگر اقبال کو خودی کا لفظ کچھ ایسا پسند آ گیا تھا کہ اس نے اس کو ترک نہ کیا

خودی کا لفظ اردو اور فارسی زبان میں غرور اور خود پرستی کے معنوں میں عام طور پر مستعمل ہے اور یہی وجہ تھی کہ پرانے زمانے کے وہ ارباب علم جو خودی کے اس مفہوم سے آشنا تھے اپنے ذہن کو ان معنوں سے خالی نہ کر سکے اور اپنے دل میں اس شک کو جگہ دینے لگے کہ اقبال کے کلام کے شیدائی اور اس کے اس نئے نظریے کے پیرو خودی کو غرور کے مترادف سمجھ کر اس عجز و انکسار سے بیگانہ ہو جائیں گے، جو ان کے نزدیک اسلامی سیرت کے لازمی عناصر ہیں۔

اگرچہ اقبال نے ان تمام اختلافات کے باوجود خودی کے لفظ کو تو ترک نہ کیا مگر اس بات کی ضرورت سمجھی کہ اسرار خودی کے پہلے ایڈیشن کے دیباچے میں خودی کے شعور کا وہ مقصد بیان کر دے، جو اس کے ذہن میں تھا اور جو وہ چاہتا تھا کہ اس کے کلام کو پڑھنے اور سننے والوں کے ذہن میں پیدا ہو جائے۔ مجھے افسوس ہے کہ یہ دیباچہ اسرار خودی کے کسی دوسرے ایڈیشن میں شائع نہ ہوا، ورنہ وہ تمام شکوک باطل رفع ہو جاتے جو بعد میں خودی کے لفظ نے اقبال کا کلام پڑھنے والوں کے دل میں پیدا کر دیئے۔ اقبال ان الفاظ میں صاف طور پر اس بات کا یقین دلاتا ہے کہ اس نے خودی کے لفظ کو ایک خاص رنگ میں استعمال کیا ہے اور یہ اس رنگ سے بالکل مختلف ہے جو عام طور پر خودی کے لفظ پر چڑھا ہوا ہے۔

> یہ وحدت وجدانی یا شعور کا روشن نقطہ جس سے تمام انسانی تخیلات و جذبات مستنیر ہوتے ہیں یہ پر اسرار شے جو فطرت انسانی کی منتشر اور غیر محدود کیفیتوں کی شیرازہ بند ہے۔ یہ خودی "انا" یا "میں" جو عمل کی رو سے ظاہر اور اپنی حقیقت کی رو سے مضمر ہے، جو تمام مشاہدات کی خالق ہے۔ مگر جس کی لطافت مشاہدے کی گرم نگاہ کی تاب نہیں لا سکتی کیا چیز ہے؟ کیا یہ ایک لازوال حقیقت ہے یا زندگی نے محض عارضی طور پر اپنی فوری عملی اغراض کے حصول کی خاطر اپنے آپ کو اس فریب تخیل یا دروغ مصلحت آمیز کی صورت میں نمایاں کیا ہے؟ اخلاقی اعتبار سے افراد و اقوام کا طرز عمل اس نہایت ضروری سوال کے جواب پر منحصر ہے اور یہی وجہ ہے کہ دنیا کی کوئی قوم ایسی نہ ہوگی جس کے حکماء اور علماء نے کسی نہ کسی صورت میں اس سوال کا جواب پیدا کرنے کے لیے دماغ سوزی نہ کی ہو۔ مگر اس سوال کا جواب افراد و اقوام کی دماغی قابلیت پر اس قدر انحصار نہیں رکھتا جس قدر کہ ان کی افتاد طبیعت پر۔ مشرق کی فلسفی مزاج قومیں زیادہ تر اسی نتیجے کی طرف مائل ہوئیں کہ انسانی "انا" محض ایک فریب تخیل ہے اور اس پھندے کو گلے سے اتار دینے کا نام نجات ہے۔ مغربی اقوام کا عملی مذاق ان کو ایسے نتائج کی طرف لے گیا جس کے لیے ان کی فطرت متقاضی تھی۔

اس تمہید کے بعد حکیم الامت نے اس دیباچے میں "انا" یعنی خودی کے ان نظریوں پر بحث کی ہے جو اس کے شعور اور شہود کے بارے میں مختلف زمانوں میں دنیا کی مختلف قوموں کے مفکروں نے قائم کئے اور جن نظریوں کی بدولت کبھی تو انسان اپنی زندگی کی تعیین ہی عمل سے کی اور کبھی وہ عمل سے اتنا بیگانہ ہو گیا کہ اس نے ترک عمل ہی کو اپنا مقصود حیات سمجھا۔ اس دیباچے کے آخر میں اقبال نے ان معنوں پر روشنی ڈالی ہے جن میں اس نے خودی کے لفظ کو استعمال

کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے :۔

شاعرانہ تخیل محض ایک ذریعہ ہے، اس حقیقت کی طرف توجہ دلانے کا کہ لذت حیات "انا" کی انفرادی حیثیت اور اس کے اثبات استحکام اور توسیع سے وابستہ ہے۔ یہ نکتہ مسئلہ حیات بعد الموت کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے بطور ایک تمہید کے کام دے گا۔ ہاں! لفظ "خودی" کے متعلق ناظرین کو آگاہ کر دینا ضروری ہے کہ یہ لفظ اس نظم میں بمعنی غرور استعمال نہیں کیا گیا جیسا کہ عام طور پر اردو میں مستعمل ہے۔ اس کا مفہوم محض احساسِ نفس اور تعین ذات ہے۔

یہ اقبال کے اپنے الفاظ جس میں اس نے خودی کے لفظ کا صحیح مفہوم بیان کیا ہے اور جن سے اس نے اپنی زندگی میں ان لوگوں کو روشناس کرا دیا تھا، جو اس کی صحبت کے فیض سے بہرہ مند ہوئے۔ لیکن کچھ تو امتداد زمانہ کے باعث لوگ رفتہ رفتہ خودی کے ان نئے معنوں سے بیگانہ ہو گئے اور کچھ اس لیے بھی کہ اقبال کے نظریہ خودی کی تشریح اور وضاحت کرنے میں بعض کرم فرماؤں نے اپنے ذاتی علم و فضل سے کسی قدر مبالغے کے ساتھ کام لیا اور اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ اقبال نے خودی کے لفظ کو جن معنوں میں استعمال کیا تھا۔ وہ کچھ دھندلے سے پڑ گئے۔ کسی نے تو اقبال کے اس نئے لفظ کے آئینے میں ہرڈل اور نیٹشے کے فوق البشر کا عکس دیکھا، کسی کو اقبال کے افکار اور برگساں کے خیالات میں مماثلت نظر آئی اور پھر نقادوں نے نیٹشے اور برگساں کے فلسفے پر بحث شروع کر دی۔ کسی نے اقبال کے کلام میں جلال الدین رومی کے افکار کا پرتو دیکھا اور اقبال کے نظریوں کی قدر و قیمت پر لکھنے کی بجائے مثنوی معنوی کی شرح لکھنی شروع کر دی۔ اور بعض لوگ تو یہاں تک جا پہنچے کہ یہ بھی کہہ گذرے اقبال کے فلسفے پر مغربی فلسفے کا رنگ چڑھا ہوا ہے۔ لیکن ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اقبال اپنے اس نظریئے کے متعلق خود کیا کہتا ہے۔ اور ان مہربانوں کا شکوہ کن الفاظ میں کرتا ہے۔ جنہوں نے اس کے تصورات کو اس رنگ میں پیش کیا۔ اس اسرار خودی کی دعا کے بعد وہ جلال الدین رومی کے ایک شعر سے اس شکوے کا آغاز کرتا ہے۔

ہر کسے از ظن خود شد یار من
وز درون من نہ جست اسرار من
در جہاں یا رب ندیم من کجاست
نخل سینایم کلیم من کجاست

پھر حضور رسول مقبول صلعم کی بارگاہ میں اپنے ان مہربانوں کی سخن فہمی اور نکتہ شناسی کی فریاد ان الفاظ میں کرتا ہے:۔

محفل از شمع نوا افروختم
قوم را رمز حیات آموختم

وانمودن خویش را خوئے خودی است
خفتہ در ہر ذرہ نیروئے خودی است
چوں حیات عالم از زور خودی است
پس بقدر استواری زندگی است

تو اقبال کے نظریئے کے مطابق خودی کے یہ معنی ہوتے کہ ہر شخص اپنی صلاحیت کو پہچانے اور اپنی استعداد کو بیدار کرے اور جب وہ اپنی صلاحیتوں سے واقف ہو جاتے اور اس پہ اپنی استعداد کے امکانات آشکار ہو جائیں، تو وہ اس قوت کو عمل میں منتقل کر دے اور عمل ہی کو اپنا مقصود زندگی اور اس مقصود کے حصول کی کوشش ہی کو زندگی سمجھے۔ خودی کے یہ معنی نہیں کہ ہر شخص اپنے آپ کو کسی بڑی تقدیر کا اہل سمجھ کر ادھر ادھر ہاتھ پاؤں مارتا پھرے اور جب کوئی مدعا اس کی دسترس سے باہر ہو اور کوئی مقصد اس کی قوت حصول سے بالاتر ہو اور اس لیے وہ اسے حاصل نہ ہو سکے تو وہ عجز جیسی بے مایہ طاقت کو اپنی ڈھال بنا کر اقبال کے اس شعر سے اپنی ناکامی کا دل بہلایا کرے۔

اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

تعین ذات اور احساس نفس کی منزلیں طے کرنے کے بغیر اور اپنی صلاحیتوں کو پرکھنے سے پیشتر ہی اپنی خودی کو اپنی استعداد کی پہنچ سے بالاتر کر دے اور زندگی کے کارزار عمل اپنی استعداد کے مطابق حصہ لینے کی بجائے ایک مصنوعی وارفتگی سے سرشار ہو کر پکار اٹھے۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

اور اس ساعت سعید کا انتظار کرتا رہے کہ کب خدا اس کی رضا کا طالب ہو اور کب اس کی خودی کا بلند مقام اپنی منہ مانگی تقدیر حاصل کرے اور یہ بھول بیٹھے کہ اقبال کہہ گیا ہے:۔

آنماید صاحب ذوق سلیم
زور خود را از مہمات عظیم

ظاہر ہے کہ ہر شخص کے قواتے جسمانی اپنی فعالیت کے لحاظ سے ایک اضافی حیثیت رکھتے ہیں۔ پس ان کے دائرہ عمل کی وسعت بھی اضافی ہے۔ اقبال کے نزدیک:۔

زندگانی را بقا از مدعا است
کاروانش را درا از مدعا است

داستانے گفتم از یاران نجد
نکہتے آوردم از بستان نجد
گفت بر ما بند و افسون فرنگ
ہست طغیانش ز قانون فرنگ
ذوق حق دہ این خطا اندیش را
اینکہ نشناسد متاع خویش را
گر دلم آئینہ بے جوہر است
ور بحرفم غیر قرآن مضمر است
خشک گردان بادہ در انگور من
زہر ریز اندر مئے کافور من
روز محشر خوار و رسوا کن مرا
بے نصیب از بوسہ پا کن مرا

پس ظاہر ہو گیا کہ اقبال نے اسرار خودی میں جو کچھ بھی بیان کیا ہے، اس کا سرچشمہ قرآن ہے اور خودی کے نظریئے میں جو حقیقتیں مضمر ہیں، وہی ہیں جو اس کے دل پر قرآن حکیم کی تعلیم نے آشکار کیں۔ اس لیے اگر ہمارا مقصد یہ ہے کہ اقبال کے نظریہ خودی کو انہیں معنوں میں سمجھیں جن معنوں میں اقبال نے اسے بیان کیا ہے، تو ظاہر ہے کہ ہمیں اقبال کے کلام ہی سے خودی کا مفہوم سمجھنا چاہیئے اور اس بات کی کوشش کرنی چاہیئے کہ اقبال کے نظریہ خودی پر وہ لباس آراستہ کریں جس میں وہ خود چاہتا تھا کہ اس کا یہ نظریہ نظر آئے۔

اس تحریر کا اس کے سوا اور کوئی مقصد نہیں کہ ہم ان حقائق پہ ایک ہلکی سی روشنی ڈال دوں جن پر اقبال کا نظریہ خودی استوار ہے اور آپ کو ان منازل سے گزار کر لے چلوں جن سے گزر کر اقبال اس منزل مقصود تک جا پہنچا، جسے وہ خودی کے نام سے موسوم کرتا ہے۔

اقبال جس خودی کو وحدت وجدانی یا شعور کا روشن نقطہ کہتا ہے، اس کا مفہوم اس کے نزدیک محض احساس نفس یا تعین ذات ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تعینات وجود کا انحصار استحکام خودی پر ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ تعینات وجود ہر شخص میں اضافی حیثیت رکھتے ہیں یا نوع انسانی میں قائم بالذات ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے کہ:

خویشتن را چوں خودی بیدار کرد
آشکارا عالم پندار کرد
می کشد از قوت بازوئے خویش
تا شود آگاہ از نیروئے خویش

زندگی در جستجو پوشیدہ است
اصل او در آرزو پوشیدہ است
آرزو را در دل خود زندہ دار
تا نگردد مشت خاک تو مزار

اس کے یہ معنی ہیں کہ جس دل میں کسی مدعا کی آرزو نہیں وہ دل زندگی کی حرارت سے محروم اور جس انسان کا دل زندگی کی حرارت سے محروم ہو وہ زندگی کے باوجود مردہ ہے۔ دل کی حرارت آرزو پر منحصر ہے اور آرزو جستجو کی محرک ہے۔ جستجو کی یہی سرگرمیاں جو ہر شخص کے قوائے فعالیہ کی استعداد پر منحصر ہوتی ہیں انسان کی زندگی تعین کرتی ہیں۔ پس ہر شخص اپنی زندگی کی تعین ایک ہی مدعا کی جستجو سے نہیں کر سکتا۔ انہیں امور کی تعین ذات ہے اور انہیں محسوسات کا احساس نفس ہے۔

نقطۂ نورے کہ نام او خودی است
زیر خاک ما شرار زندگی است

پس یہ نقطۂ نور جس کی تجلیوں سے انسان پہ اس کی ذات کے امکانات روشن ہو جاتے ہیں اور زندگی کا یہ شرار جو اس کے نفس کو احساس سے گرما دیتا ہے۔ نہ تو غرور ہے کیونکہ غرور کی بنیاد فقدان تعین ذات پر ہے۔ اور نہ ہی اپنی استعداد سے کسی بالاتر مدعا کے حصول کی آرزو۔ کیونکہ یہ چیز احساس نفس کے متضاد اور متخالف ہے۔ اقبال کی خودی عمل کا پیغام دیتی ہے اقبال کی خودی انسان کو اپنی قوتوں سے آگاہ کرتی ہے اور جب یہ خوابیدہ قوتیں بیدار ہو جاتی ہیں تو وہ اپنے میدان عمل خود تلاش کر لیتی ہیں۔ یہی جستجو اپنے مدعا کی تشکیل پر منتج ہوتی ہے اور یہی مدعا انسان کی زندگی کا مقصد بن جاتا ہے۔ یہی زندگی کا مقصد اقبال کے نزدیک زندگی ہے اور اس کے حصول کی کوشش زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

ظاہر ہے جو شخص اپنی استعداد ہی سے واقف نہیں وہ اپنی خودی کے مقام کا تعین نہیں کر سکتا اور جو شخص اپنی خودی کے مقام کے تعین سے قاصر ہو، اس کی جستجو ایک تہمت ہے اور اس کا مدعا ایک افترا۔ عمل ہی سے زندگی کی تشکیل ہوتی ہے۔ عمل ہی سے زندگی کا اظہار ہے۔ مگر عمل قویٰ کی استعداد پر منحصر ہے اور اسی استعداد کا تعین تعین ذات ہے جس کو اقبال نے خودی کے نام سے موسوم کیا۔

پس اقبال کے نظریہ خودی سے اگر فائدہ اٹھانا چاہتے ہو تو ان جہانوں کی طرف نہ دیکھو جو ستاروں سے آگے ہیں۔ اپنی صلاحیتوں کا جائزہ لو۔ اپنی استعداد کو تولو۔ اور پھر سرگرم عمل ہو جاؤ۔ تمہارا عمل اپنے لیے خود نئی نئی راہیں نکال لے گا۔ اور ہر نئی راہ تم کو ایک نئی منزل مقصود کی طرف لے جائے گا اور پھر ہر منزل مقصود ایک نئی

منزل مقصود کی طرف اشارہ کرے گی یہاں تک کہ تم ان جہانوں میں پہنچ جاؤ جو ستاروں سے آگے ہیں۔ مگر شرط یہ ہے کہ تمہاری خودی ان تمام امتحانوں کی کسوٹی پر پوری اترتی چلی جائے۔ جو اس راہ میں قدم قدم پر پیش آتے ہیں اور تمہارا دل کبھی اس حقیقت سے غافل نہ ہو کہ۔

ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں۔

اقبال نے خودی کی یہ تصویر کھینچ کر تربیت کے مراحل بھی بتا دیئے ہیں۔ اقبال کے نزدیک خودی کی تربیت کا پہلا مرحلہ اطاعت ہے۔ دوسرا مرحلہ ضبط نفس اور تیسرا مرحلہ نیابت الٰہی۔ اقبال نے دعوئے کیا ہے کہ اس کی نظم میں قرآن کے فلسفے کے سوا اور کوئی فلسفہ نہیں۔ اور اس کے نغمے کی لے کسی فرنگی ساز کی صدا ئے بازگشت نہیں۔

جب ہم قرآن کے قائم کئے ہوئے معیار پر اقبال کے نظریہ خودی اور خودی کی تربیت کے لیے اس کے تجویز کئے ہوئے نسخے کو پرکھتے ہیں تو صاف نظر آجاتا ہے کہ نیابت الٰہی کا مقام "إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً" ہی کی ایک واضح اور روشن تفسیر ہے۔

جب منیب نے اپنے نائب کو علم و حکمت کے وہ جوہر عطا فرما دیئے جن سے نائب میں منیب کے علم و حکمت کی حکمت کی جھلک نظر آنے لگی تو لازم آیا کہ منیب نائب کے قبضہ تصرف میں وہ قوتیں بھی لے آئے جن سے تقدیریں بنتی اور بگڑتی ہیں۔ جلال الدین رومیؒ نے اسی حقیقت کو اس طرح بیان کیا ہے۔

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود ۔ گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

اقبال بھی بشر کو یہ بھولا ہوا سبق یاد دلاتا ہے :۔

نائب حق در جہاں بودن خوش است
بر عناصر حکمران بودن خوش است
نائب حق ہمچو جان عالم است
ہستی او ظل اسم اعظم است
از رموز جزو و کل آگہ بود
در جہان قائم بامر اللہ بود

ظاہر ہے کہ نیابت الٰہی کے مقام کے علم اور اس مقام کے حصول کی آرزو کے احساس سے بشر کی خودی اس بلندی پر پہنچ جاتی ہے جو ملائک کی پرواز سے بھی بالاتر ہے اسی وجدان اور عرفان سے سرشار ہو کر اقبال پکار اٹھا تھا کہ

در دشت جنون من جبریل زبون صیدے
یزداں بکمند آور اے ہمت مردانہ

مگر اقبال نیابت الٰہی کے مقام تک پہنچانے سے پہلے انسان کو ان مراحل سے گزارنا چاہتا ہے جو اس کے نزدیک اس منزل مقصود تک پہنچنے کی لازمی شرائط ہیں

خلقت جن و بشر کے بارے میں جس قرآن کا نظریہ یہ ہو کہ "مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنَ" اس قرآن کے فلسفے کی تعلیم دینے والا اور اس قرآن کے نظریوں کے مطابق بشر کو نیابت الٰہی کے راز بتانے والا عبدیت اور اطاعت سے کیسے بے نیاز ہو سکتا تھا۔ اقبال نے اطاعت کو خودی کے مقام کی پہلی منزل قرار دیا ہے۔ اطاعت حقیقت میں عبدیت اور عبادت کا اصل اصول ہے۔ جب قرآن میں اللہ خود فرماتے ہیں ہم نے اپنی مخلوق کو صرف عبدیت کے فرائض انجام دینے کے لیے پیدا کیا ہے۔ اور عبدیت کی ظاہری شکل اطاعت کے سوا اور کچھ نہ ہو تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ نیابت الٰہی کے مرتبے کو حاصل کرنے والا انسان اطاعت کی منزل سے ہو کر نہ گزرے۔ انسان کی اسی ذمہ داری کو محسوس کر کے اور فرض کی بجاآوری ہی کو انسان کی زندگی کا کمال سمجھ کر اقبال کہتا ہے:

تو ہم از بار فرائض سر متاب
بر خوری از عندہ حسن المآب
در اطاعت کوش اے غفلت شعار
می شود از جبر پیدا اختیار
ناکس از فرمان پذیری کس شود
آتش ار باشد ز طغیان خس شود
ہر کہ تسخیر مہ و پروین کند
خویش را زنجیری آئین کند

اسی مضمون پر اردو میں اقبال کا ایک حکمت آفریں شعر کس قدر سبق آموز ہے:

دہر میں عیش دوام آئین کی پابندی سے ہے
موج کو آزادیاں سامان شیون ہو گئیں

پس اپنی آزادی کو قانون کی حدود کے اندر محدود کر دینے کا نام اقبال کے نزدیک اطاعت ہے اور تعین ذات کی یہی پہلی منزل ہے۔ قانون کی مقرر کی ہوئی حدود کے اندر رہ کر "انا" کا احساس وہ دروازہ ہے جس میں داخل ہو کر انسان خودی کے قصر تک جا پہنچتا ہے۔ جو شخص اپنے "انا" کو قانون کی حدود سے بالاتر سمجھے اور اپنی خودی کی پرواز کو آئین کی حدود میں محدود نہ کرے وہ اپنے محل اور مقام سے آشنا نہیں اور جو شخص اپنے محل اور مقام سے آشنا نہیں وہ قرآن کی زبان میں ظالم ہے۔ وہ اپنی ذات پر بھی ظلم کرتا ہے اور دوسروں پر بھی ظلم کرتا ہے۔

اس لیے اس دنیاوی نظام میں انسان کا اپنی استعداد کے مطابق کسی مقصد کو تلاش کر لینا اور اس مقصد کے حصول کے لیے اپنے قویٰ کو سرگرم عمل کر دینا اور پھر عمل کے میدان میں قوانین و ضوابط کی حدود کے اندر رہ کر اپنے "انا" کے مقام کو پا لینا خودی ہے۔ خودی یہ نہیں سکھاتی کہ انسان دوسروں کا محل اور مقام نہ پہچانتے، اور ضبط و نظم سے بیگانہ ہو کر حفظ مراتب کا پاس نہ رکھے۔

•

آئین وضوابط کی حدود کے اندر رہ کر اپنی خودی کے مقام کو پہچاننے کا جوہر انسان میں وہ سیرت پیدا کر دیتا ہے جو اقبال کے نزدیک خودی کی منزلِ مقصود تک پہنچنے کی دوسری منزل ہے اور جس کو وہ ضبطِ نفس کے نام سے تعبیر کرتا ہے یہ سیرت انسان کو اس کے اپنے قویٰ پر غالب کرتی ہے اور اسے اپنے ہر فعل میں اعتدال کو ملحوظ رکھنا سکھاتی ہے۔ اور جب انسان کے قویٰ اس سیرت کے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں تو ان سے کوئی ایسا فعل صادر ہی نہیں ہوتا، جو آئین و ضوابط کی حدود سے باہر ہو، گویا ضبطِ نفس اگرچہ اطاعت کا لازمی نتیجہ ہے۔ لیکن اپنے جوہر کے لحاظ سے حد شناسی کی ایک دوسری مگر اس سے بہت ارفع صورت ہے۔ اطاعت میں دوسرے کے حکم کی پابندی لازم آتی ہے۔ لیکن ضبطِ نفس میں انسان کی عقلِ سلیم خود ہی اپنے نفس پر حکمران ہو جاتی ہے۔ اقبال کے نزدیک جو شخص اپنی خودی کا تعین ضبطِ نفس سے نہیں کرتا۔ یعنی اپنے نفس اور اپنی ذات کو اپنے زیرِ فرمان نہیں کرتا۔ وہ خودی سے بیگانہ ہے اور ایسی خودی اس کے سوا کسی اور نتیجے پر منتج نہیں ہوتی کہ کوئی دوسری جابر و قاہر طاقت اس کو اپنے زیرِ فرمان لے آئے۔ اقبال اس حقیقت کو اس طرح بیان کرتا ہے۔

ہر کہ بر خود نیست فرمانش روان
می شود فرمان پذیر از دیگران

یاد رہے کہ اقبال نے دیگران سے جن طاقتوں کو منسوب کیا ہے ضروری نہیں کہ وہ خارجی ہوں۔ طاقت جو کسی انسان کی خودی کو اپنے قبضۂ اختیار میں لے آتی ہے، اس کا ردِ عمل خوف ہے اور اسی لیے اقبال نے طاقت کو خوف کے مترادف سمجھا اور ظرف کو اس باب میں طاقت ہی کے معنوں میں استعمال کیا اور پھر وہ طاقت اور خوف کا تجزیہ کرتے کرتے ایک قدم اور بڑھ گیا۔ اور اس نے متاعِ حیات کی محبت کو بھی اس کے ضیاع کا خوف سمجھ کر ایک طاقت کا ذریعہ دے دیا اور کہا کہ۔

خوفِ دنیا خوفِ عقبیٰ خوفِ جان
خوفِ آلامِ زمین و آسمان
حبِ مال و دولت و حبِ وطن
حبِ خویش و اقربا و حبِ زن
تا عصائے لاالٰہ داری بدست
ہر طلسمِ خوف را خواہی شکست

یہ اقلیمِ لا جس میں اقبال چاہتا ہے کہ انسان آباد ہو، خودی کی وہ دوسری منزل ہے جس سے گزر کر انسان نیابتِ الٰہی کے بلند مقام پر پہنچ جاتا ہے۔ لیکن یہ مقام ایک نازک مقام ہے ایک مشکل مقام ہے۔ ایک ایسا مقام ہے جہاں "انا" "لا" کی لذتوں سے آشنا ہو کر بھی اپنے آپ کو عالمِ وجود کی ذمہ داریوں سے آزاد نہیں کر سکتا اور اسی لیے اقبال نے ضبطِ نفس کو مقامِ خودی کا دوسرا مرحلہ اور اطاعت کو اس کا پہلا مرحلہ بتایا۔ تاکہ انسان "لا" کی اقلیم تک

اس وقت پہنچے جب وہ اپنے وجود کی ذمہ داریوں سے آگاہ ہو جائے۔ یہ نہیں کہ اس کائنات میں رہ کر جس کا ذرہ ذرہ اپنے پروردگار کے مقرر کیے ہوئے قانون کی حدود کے اندر محدود ہے۔ وہ اپنی ذمہ داریوں سے انکار کر بیٹھے۔ اس "لا" کے اگر کوئی معنی ہیں تو یہ کہ دنیا اور عقبیٰ کا خوف اور مال و دولت اور خویش و اقربا کی محبت انسان پر ایسی غالب نہ آجائے کہ وہ اس خوف اور محبت کے ترجمات میں گھر کر اپنی خودی کو کھو بیٹھے۔ اس "لا" کے یہ معنی نہیں کہ وہ اطاعت کی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو جائے یا ان فرائض کی انجام دہی سے فارغ ہو بیٹھے جن کا بارگرانِ بشریت کے مقتضیات نے اس کے کندھوں پر رکھ دیا ہے۔ اقبال چاہتا ہے کہ انسان کی خودی اس کو مجبور کر دے کہ وہ اپنے قویٰ کو عمل کا خوگر بنائے۔ اس کا عمل نتائج سے بے نیاز ہو۔ مگر فرائض کے احساس سے بیدار وہ اپنے مدعا کے حصول کے لیے نئی نئی راہیں نکالے۔ مگر اس کی یہ ہر نئی راہ آئین و ضوابط کی حدود کے اندر ہو۔ وہ اس لیے سرگرم عمل رہے کہ اس کا عمل ہی اس کا سب سے بڑا انعام ہے اور اس کی محنت کسی اعتراف کی محتاج نہیں سورج ہر روز روشنی اور حرارت پھیلاتا ہے مگر اس روشنی اور حرارت کو پھیلانے کا کوئی اجر نہیں چاہتا۔ اس کی روشنی کا یہی انعام بس ہے کہ دنیا اس کے نور سے منور ہو جاتی ہے اور اس کی حرارت اس سے زیادہ اور کوئی صلہ نہیں چاہتی کہ درخت پھول پھل لے آئیں اور کھیت لہلہانے لگیں۔ مزدور کی خودی کا تعین ان پائیوں اور دھیلوں سے نہیں ہوتا جو اسے اس کی محنت کی کمائی سے ملتے ہیں۔ اس کی خودی کا تعین ان فلک بوس محلوں اور قصروں سے ہوتا ہے جن کی دیواروں کو وہ اپنے سر پر اینٹ اور پتھر اٹھا اٹھا کر زمین سے آسمان تک پہنچا دیتا ہے۔ دہقان کی خودی کی تعین روئی کے ان گالوں اور گیہوں کے ان خوشوں سے نہیں ہوتی جو اس کی محنت کا ثمر بن کر اس کے دامن میں گرتے ہیں اس کی خودی کی تعین ان پکے ہوئے کھیتوں سے ہوتی ہے جن کو اس کی محنت کا گاڑھا پسینہ سیراب کرتا ہے۔

اقبال کی خودی بھی وہی نقطہ نور ہے جس سے زندگی روشنی اور حرارت پھیلاتی ہے۔ مگر اس کے لیے کوئی صلہ نہیں چاہتی، کوئی انعام نہیں مانگتی۔ کسی تعریف اور تحسین کے لیے چشم براہ نہیں رہتی۔ اس خودی کا رمز شناس ہی اقبال کے نزدیک حقیقی معنوں میں ملت کا ایک کارآمد فرد ہے اور اس پر یہ راز روشن ہے کہ جب ملت معرض وجود میں آجائے تو اس کے افراد کی کامرانیاں اور اقبال مندیاں صرف اسی لیے ہوتی ہیں کہ ملت کے بحرِ بیکراں میں فنا ہو کر بقائے دوام حاصل کر لیں۔

خودی کا سرِ نہاں لا الٰہ الا اللہ
خودی ہے تیغ فساں لا الٰہ الا اللہ

اب "انا" کے یہ معنی ہوتے کہ انسان ایمان کی نعمت سے بہرہ مند ہو جاتے اور "لا" کے معنی کہ انسان دنیا کے مال و متاع اور زندگی کی زینتوں کو ایمان پر ترجیح نہ دے۔ اور جب ایک طرف دنیاوی جاہ و حشم اپنی تمام دلفریبیوں کے ساتھ اس کے گوشۂ چشم کے منتظر ہوں اور دوسری طرف ایمان کی ہیبت کسوٹی اپنی ساری ہلاکت آفرینیوں کے ساتھ اس کے صبر و استقلال کے جوہر کو پرکھنے کے لیے انتظار کر رہی ہو تو وہ اپنے ذاتی امن و عافیت اور عظمت

و اقبال کو ٹھکرا کر وہ پر خطر رستہ اختیار کرے جس میں قدم قدم پر کانٹے بچھے ہوتے ہیں۔ لیکن جو اس منزل مقصود کو جا نکلتا ہے۔ جسے اقبال کی زبان میں خودی اور قرآن کی زبان میں "فوز عظیم" کہتے ہیں۔ اور جو انسان کی سب سے بڑی مراد مندی اور خود شناسی ہے۔ اس خودی کے رمز شناس ہی وہ صاحب ایمان فقیر ہیں، جن کی بساط عجز کو ایسی رفعتیں حاصل ہیں جو بادشاہوں کے تخت و سریر کو بھی نصیب نہیں اور یہی وہ گدایان بے نوا ہیں۔ جن کی آواز کا جلال بڑے بڑے شاہنشاہوں کو رعشہ بر اندام کر دیتا ہے۔ سیرت انسان جب ایمان کے اس مضبوط سانچے میں ڈھل جاتی ہے تو اسے صراط مستقیم سے کوئی طاقت متزلزل نہیں کر سکتی اور اس کی فطرت میں ایمان صراط مستقیم کی تجلیوں کا وہ جذبہ پیدا کر دیتا ہے کہ اس کے آئینے میں حسن عمل کے سوا اور کوئی نقش نہیں جم سکتا۔ یہی وہ مقام ہے جس سے بلند تر کوئی مقام نہیں اور یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف قرآن نے ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے:

و انتم الاعلون ان کنتم مومنین۔ حاصل کلام وحدت وجدانی یا شعور ذات کا جو نظریہ خودی کے نام سے اقبال نے پیش کیا ہے وہ افراد کے ایمان و عمل کے سوا اور کچھ نہیں۔ اقبال کے نزدیک افراد کا ایمان و عمل جب اجتماعی طور پر ملت کے ایمان و عمل کی صورت اختیار کر لیتا ہے تو باوجود کثرت اس میں وحدت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور یہ وحدت تصور اور وحدت عمل ملت کے افراد کو ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح مربوط کر دیتی ہے کہ ان کے عزائم کو دنیا کی کوئی طاقت شکست نہیں دے سکتی۔ افراد کی اجتماعی طاقت ملت کی قوت بن جاتی ہے۔ اس قوت کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا آلہ بنانا نیابت الٰہی کا اولین فرض ہے۔ اس نیابت الٰہی کی جھلک اس خاک کے پتلے میں اقبال کو ایسی صاف اور روشن نظر آتی کہ وہ پکار اٹھا:

نوع انساں را بشیر و ہم نذیر
ہم سپاہی ہم سپہ گر ہم امیر
زندگی بخشد ز ایجاد عمل
می کند تجدید انداز عمل
جلوہ ھا خیزد ز نقش پائے او
صد کلیم آوارۂ سینائے او
زندگی را می کند تفسیر نو
می دہد این خواب را تعبیر نو

اور پھر وہ اس دانائے اسرار خودی کو اس طرح خطاب کرتا ہے:

اے سوار اشہب دوراں بیا
اے فروغ دیدۂ امکاں بیا
رونق ہنگامۂ ایجاد شو
در سواد دیدہ ھا آباد شو

مقصود کلام یہ ہے کہ اقبال کے نظریہ خودی کو ان دو بڑی تہمتوں سے آزاد کرنے کی کوشش کی جائے ایک تو یہ کہ اقبال کی خودی انسان کو غرور سکھاتی ہے اور ضبط اور حفظ مراتب کی حدود سے آزاد کر دیتی ہے اور دوسرا یہ کہ اقبال کا نظریہ خودی کسی مغربی تصور کا عکس ہے۔ ظاہر ہے کہ اطاعت اور ضبط نفس کی منزلوں سے گزار کر نیابت الٰہی کے مرتبے تک پہنچانے والا اقبال انسان کو نہ تو غرور اور سرکشی کی تعلیم دیتا ہے اور نہ ایسے حد شناسی اور ضبط کی پابندیوں سے بے نیاز کرتا ہے۔ عمل کو عبدیت کی ذمہ داریوں سے آشنا کرنے والا اقبال انسان کو ہٹلر اور نیٹشے کے فوق البشر کی خودسری نہیں سکھاتا اس کو فرد اور ملت کے قرآنی تصور کے سانچے میں ڈھال کر اس پر خودی کا یہ نازک اور مشکل راز آشکار کرتا ہے۔

انا الحق جز مقام کبریا نیست
سزائے او چلیپا ہست کا نیست
اگر فردے بگوید سرزنش بہ
اگر قومے بگوید ناروا نیست